سیّد ابوالخیر مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنویرِ افکارِ بشری میں قرآن کا حصہ

المعارف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سیّد ابوالخیر مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعدد قیمتی مقالے شائع کیے ہیں۔ آخری مقالہ 'تراجم القرآن' المعارف، اکتوبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل اُنھوں نے سرمد، داراشکوہ اور اورنگ زیب پر لکھا تھا، جسے اہلِ علم نے پسند کیا اور اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

موجودہ مقالہ: ''تنویرِ افکارِ بشری میں قرآن کا حصہ'' ایسے وقت میں شائع کیا جا رہا ہے، جب بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ فرقہ واریت، تنگ نظری اور تشدد کی آگ میں جل رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں انسان کو (خاص طور پر مغرب میں) اپنی فکری آزادی کے لیے بڑے دُکھ اُٹھانا پڑے۔ یہ انسان کی خوش بختی تھی کہ ساتویں صدی میں قرآن مجید کے نزول کے بعد فکری آزادی کی ایک صحت مند روایت قائم ہوئی۔ جب مکہ کی مقدس سرزمین میں پیغمبر عربی ﷺ نے فرمایا: ''دین کے بارے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔'' اور ایسے ہی قرآن نے بار بار فرمایا کہ انسان کو کائنات میں غور و فکر اور عقل و دانش سے کام لینا چاہیے اور جو ایسا نہیں کرتے، ان کے بارے میں کہا گیا کہ ''ان کی آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں، کان ہیں لیکن سنتے نہیں، دل ہیں مگر سوچتے نہیں۔'' (سورۂ اعراف)

مرحوم سیّد صاحب نے اپنے موضوع پر یعنی فکرِ انسانی کو روشن کرنے میں قرآن کا کردار، جس دقتِ نظر سے لکھا ہے، اس پر آدمی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بدقسمتی سے اس مقالے کا آخری صفحہ گم ہو گیا۔ مقالے میں چند جگہوں پر قوسین میں توضیحی الفاظ ہمارے ہیں۔ ایسے ہی قرآن مجید کی سورتوں کے لیے سیّد صاحب نے نمبر دیئے ہیں، مثلاً سورۃ بقرہ کے لیے نمبر ۲، ہم نے نمبر کی بجائے سورۃ کا نام دے دیا ہے۔

اُمید ہے کہ قارئین اس مقالے سے لطف اندوز ہوں گے۔ [ایڈیٹر]

(۱)

غالباً یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ فکرِ بشری کی تحریک و تحریر میں قرآن مجید کا اثر بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں، جس سے معلوم ہو کہ ظہورِ اسلام

سے پہلے دُنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گزری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کس قسم کا مدوجزر اور آزادی وغلامی کا الٹ پھیر رہا ہے۔ یہ بیان ہمیں اس بات کو ٹھیک طور پر جاننے اور اندازہ کرنے میں مدد دے گا کہ قرآن نے عقلِ انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دِلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے، جس تک انسان کے خالق نے اوّل آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

رومن سلطنت کے عام سیاسی قانون کی بنیاد، ادیان وعقائد اور افکار کی کھلی آزادی پر تھی، یہ حالت ایک زمانے تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ ہی روک ٹوک اور بندشوں کا وہ دَور شروع ہوا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانے میں بعض شعرائے یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ جن خرافات، رسموں اور تنگ دلی وتنگ نظری پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا، ان میں 'ہرقالی توس' (Heracleitus) اور 'ذی مقراتیس' (Democritus) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں نے مادۂ طبیعیہ کی تحقیق وتفتیش کے بعد نفسِ بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا، یعنی ہر شے کو عقل وفکر کی کسوٹی پر جانچنا پرکھنا۔ یہی طریقہ 'انک غورس' (Anaxagoras) کا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔

انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا، اسی نے ان علمائے تربیت کے لیے راہ صاف کی جو صوفیہ یا سفسطائیہ (Sophists) کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ علماء پانچویں صدی قبلِ مسیح میں ظاہر ہوئے اور اُنھوں نے قرنِ مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق وسیاست کے نقطۂ نظر سے حیاتِ اجتماعی کے اصول وقواعد وضع کیے، اور خطاء وصواب، قوانینِ منطق اور عقل وخطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی

قلیل طبقے --- علماء و مفکرین کے طبقے --- سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رہے عوام، تو وہ ہر جگہ اوہام و خرافات کے بندھنوں میں گرفتار رہے۔ البتہ اس عہد میں اثنیہ (Athens) جس آزادیٔ فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اثنیہ کے زعیم حریت 'پیرک لیز' (Pericles) کے عہد میں، کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا، اور اس کی طاقت نے 'اثنیہ' کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی 'انک غورس' کو قانون کی گرفت سے بچایا۔

اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مذہب کے خلاف خروج (بغاوت) کرتے، وہ سزا سے کسی صورت بچ نہیں سکتے تھے، اور اس مطلب کی جو کتاب شائع ہوتی تھی، اس کو جلا دیا جاتا تھا۔ لیکن بے دین منطقیوں (Rationalists) کے خلاف جو منظم شورشیں اور سختیاں پہلے ہوتی تھیں، وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی، تمدنی اور مالی ترقی کے زمانے میں جو قضایا مسلم تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے، وہ بھی سیاستِ عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مذہب کی افادیت کے قائل تھے۔ کیوں کہ ان کے فلاسفہ اکثر اس قسم کے عقائد و نظریات علانیہ بیان کر دیتے تھے جو حیاتِ اجتماعی میں اضطراب و انتشار پیدا کرنے والے ہوتے۔ یونانیوں میں جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا۔ ان میں ایک 'سقراط' ہے جو بجا طور پر علمائے تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر مانا جاتا ہے۔ 'سقراط' کو جس چیز نے ممتاز و یکتائے روزگار بنا دیا تھا، وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشے کے طریق میں نہایت مضبوط تھا، اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کی باتیں سنتے۔ ان کو اپنے زورِ تقریر سے اس نقطے پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے قبول نہ کریں۔ رسموں اور تقلیدوں کی بندشوں میں بندھے نہ رہیں، ہر بات کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کے

دیکھیں، عوام کی خواہشوں اور رغبتوں سے بے پروا ہو جائیں اور ہر بحث و تحقیق کے لیے اپنا سینہ کشادہ کر لیں۔ 'سقراط' نے علم کی اشاعت اور تلاشِ حق اور فکرِ صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کی ہے۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا، جس کی ابتداء کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و نام وری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جدل اور تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی مطلق پروا نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے برے نتائج ظاہر ہوں گے۔ ان لوگوں نے صواب و ناصواب، حق و باطل اور فضیلت و رذیلت کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ لوگوں کے لیے صحیح اور غلط میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ اور علمِ صحیح کے حدود و نشانات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اُنھوں نے فکر و نظر کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ، اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا، جس کے اساس و ارکان پر تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں، اس غرض سے نہیں کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لیے، محض جاہل بننے اور جاہل تر بنانے کے لیے!

پس جب 'سقراط' عقلِ رزین و رائے سدید اور علمِ صحیح لے کر آیا تو اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے، اور ان کی رہنمائی کے لیے اسی رستے پر چلے جس پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لیے چلتے تھے۔ اگر وہ ان کی تعلیم و تلقین میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا، جن کے وہ گرویدہ ہو چکے تھے، تو وہ ان کو اپنے طریقے کی طرف کھینچ سکتا نہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا۔ 'سقراط' کے زمانے تک تربیتِ عالیہ کو 'یونان' کے سیاسیین (اہلِ سیاست) و مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ باوجودے کہ 'اثنیہ' اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری و آزاد خیالی کے لیے دُنیا بھر میں مشہور تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں حریتِ فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہلِ اثنیہ کے ظلم و ستم کی وہ

داستانیں سناتی ہے، جن کے باور کرنے سے وہم انکار کرتا ہے۔ 'سقراط' مناظرہ و مجادلہ اور تشکیک و نقد کے فن میں کمال درجہ ماہر تھا۔ اور لوگوں کے رسوم و عقائد کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی۔ اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی، جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی۔ وہ فلاسفہ اور ان کے سردار 'سقراط' سے جنگ کرنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اُنھوں نے جھوٹے قصے گھڑ کے ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اُڑایا، 'سقراط' جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف بھڑک اُٹھی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقائد خراب کرنے والا قرار دے کر ۲۹۹ قبل مسیح میں قتل کر دیا۔ اس پر نوجوانوں کے عقائد بگاڑنے کا الزام تھا۔ اس الزام کی تردید میں اس نے دو باتیں پیش کی تھیں:

(۱) ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے، تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ مخالف ہو یا موافق، اور چاہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحبِ اثر ہو یا کوئی ادارہ ہو۔

(۲) اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے، کیوں کہ آزاد مباحثے میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم کی ضامن ہے۔

اس واقعہ کے ستر سال بعد 'ارسطو' کو بھی اسی انجام کے خوف سے 'اثنیہ' چھوڑنا پڑا۔ کیوں کہ وہاں اس کو بھی ملحد شمار کیا جانے لگا تھا۔

'سقراط' کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد 'افلاطون' نے ایک نئی ضرب لگائی، جس نے حریتِ فکر اور مباحثے کی جانب پیش قدمی کو رجعت سے بدل دیا۔ وہ اپنی مثالی ریاست Ideal State میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے، جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہے، جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے 'افلاطون' اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ گفتگو اور مباحثے کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے، جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

'سقراط' کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں، جس سے فلسفے کے متعدد مذاہب نے جنم

لیا، اور فلاسفہ کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوا، جن میں 'افلاطون' و 'ارسطو' اور رواقیہ Stoics وغیرہ شامل ہیں، جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنھوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دیئے اور اہلِ یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی لائقِ ذکر ہے کہ اگرچہ اپی کورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا اور اس کی نظر مادہ اور مادیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی، تاہم وہ جدتِ فکر کی دشوار گزار گھاٹیوں سے اس حیرت ناک سرعت کے ساتھ گزرا کہ خوابیدہ عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا۔ حتیٰ کہ ایک رومی شاعر کو اس کے فلسفے میں وحی و الہام کا جلوہ نظر آیا، جس کو اس نے اپنے قصیدے ''طبیعۃ الدنیا'' میں بیان کیا ہے۔

انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفے کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا۔ بلکہ درحقیقت اس مذہب نے اجتماعی قوانین کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا، جن کا 'سقراط' نے کچھ بھی ذکر نہ کیا تھا۔ رواقی فلسفے نے رومی قوانین پر خاص اثر کیا، کیوں کہ رومی سلطنت کے قانونِ مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہارِ رائے کی پوری حریت پر تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

رومی سلطنت اسی آزادیٔ فکر اور حریتِ دینی کے قانون پر چل رہی تھی کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کے لیے مذہبی آزادی کے اصول کو چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے اور یہودیت بالطبع رومیوں کے وثنی عقائد کی مخالف تھی، اور رومیوں کو ایک آن گوارا نہ تھی۔ یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت اور بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'تراجان' (Trajan) نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا جو نصرانیت کے پیرو تھے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کر دیں جن کا مقصد یہ تھا کہ حد سے زیادہ قتلِ عام نہ ہونے پائے۔ لیکن بعد کو قیصر 'ڈیو کلیتیان' (Dioclectian) نے حکومت کے مذہب کی تائید کا عزم کر لیا اور پوری سنگ دِلی و

قساوت کے ساتھ مسیحیوں کا قتلِ عام کرایا۔ جس چیز نے اس رومی تاج کو اس قساوت پر آمادہ کیا، وہ یہ تھی، مسیحیت، رومیوں کی اس عبادت کے مخالف تھی، جس کا مرکز رومن امپائر کا تخت تھا۔ بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ قومیں ان کے تاج وتخت کو اپنی عبادت کے لیے مخصوص کر لیں تاکہ ان کی وحدتِ قومی باقی رہے، اور تخت سے ان کا خالص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن جب قسطنطین اعظم نے نصرانیت قبول کر لی، صورتِ حال دفعتہً بدل گئی۔ اس سے پہلے دوسو برس تک تو مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے، اور عقیدہ ایسی چیز نہیں ہے، جو زبردستی کسی کے دل میں اتارا جائے۔ لیکن 'قسطنطین' کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ یکسر یہ سب اصول منقلب ہو گئے۔ اب حکام اور فرمانروا بیشتر سیاسی اغراض کے لیے اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے۔ جگہ جگہ ہولناک قتلِ عام برپا ہوئے۔ دُنیا سے امن وسلامتی رخصت ہوگئی، دِلوں سے اطمینان وعافیت کی متاع چھن گئی۔ اب ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات، مسیحیت قبول کیے بغیر نہیں ہوسکتی اور جو اس کو قبول نہ کرے، اس کو کوئی فدیہ عذابِ دُنیا سے بچا سکتا ہے، نہ عذابِ آخرت سے، چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں، اور اس نے کیسے ہی نیک کام کیے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ جو بچہ بپتسمہ لیے بغیر مرجائے، وہ آخرت میں پیٹ کے بل ہمیشہ دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہے گا۔ ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک پیشوائے بزرگ 'سینٹ آگس ٹائن' (St. Augustine) (متوفی سنہ ۴۳۰ء) نے مسیحیت قبول نہ کرنے والوں پر جبر وظلم کرنے کے لیے ایک نیا ضابطہ مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل نافذ رہا۔ جب کبھی نصرانیوں کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوئی۔ یا کوئی ایسا عقیدہ اُبھرتا جو کلیسا کے نفوذ واثر کو کم کرنے والے ہوتا، تو اس عقیدے کے پیروؤں کو کلیسا کے چھوٹے بڑے سردار ہدفِ جور وستم بنا لیتے اور ان کو بے دریغ سزائیں دیتے۔ پوپ 'انوسنٹ' (Innocent) نے کاونٹ 'تولوز' کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کر دے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا اور جب

کاونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا، جس میں اس کی رعایا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا، کاونٹ کی املاک ضبط کر لی گئیں، اس کی شوکت مٹا دی گئی، اور پوپ نے اس وقت تک اس سے صلح نہ کی، جب تک کاونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کر دینے کی شرط نہ مان لی۔

یہی اساس تھی جس پر سنہ ۱۲۳۳ء میں ملحدوں کی تحقیقات کے لیے نظامِ تفتیش (Inquisition) قائم کیا گیا۔ اس کی تنظیم پوپ انوسنٹ چہارم کے عہد میں (سنہ ۱۲۵۲ء میں) مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں اس کو نافذ کر دیا گیا۔ پادریوں کو مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کیے گئے، جن کے استعمال میں ان سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نصرانی بادشاہوں نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لیے ظالمانہ قوانین وضع کیے۔ باوجودیکہ 'فریڈرک' دوم (Frederick II) نہایت آزاد خیال فرمانروا تھا، لیکن اس نے بھی اپنی مملکت میں یہ قانون نافذ کیا کہ نصرانیت میں جو شخص کوئی بدعت نکالے، اس کو دین سے خارج سمجھا جائے، توبہ کر لے تو اس کو قید کی سزا دی جائے، توبہ نہ کرے تو آگ میں جلا دیا جائے۔ توبہ سے پھر جائے تو قتل کر دیا جائے۔ تینوں مذکورہ صورتوں میں اس کی ساری املاک ضبط کر لی جائیں اور اس کا گھر ڈھا دیا جائے۔ اس قانون میں کوئی استثناء نہ تھا۔ بچے اور عورتیں بھی رحم کے مستحق نہ تھے۔ اگر وہ ملحدوں اور بدعتیوں کی مخبری نہ کریں۔ چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اس کی پاداش میں وہ بھی اسی سزا کے مستحق تھے۔ 'فریڈرک' نے الحاد و بدعت کے لیے سولی کی سزا مقرر کی تھی۔ بہ حکم 'اطالیہ' اور 'جرمنی' میں پندرہ سال (سنہ ۱۲۲۰ء-۱۲۳۵ء) تک جاری رہا۔

اس کے بعد یہ نظامِ تفتیش سارے مغربی یورپ میں نافذ کر دیا گیا، 'ہنری' چہارم و پنجم کے زمانے میں 'انگلستان' میں بھی الحاد کے متہم کو سولی کی سزا دی جاتی تھی۔ یہ قانون سنہ ۱۴۰۰ء میں نافذ اور سنہ ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا۔ پھر دوبارہ ملکہ 'میری' کے عہد میں نافذ کیا گیا اور سنہ ۱۶۷۶ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا۔ لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین

وحشیانہ طریقوں کے ساتھ نافذ رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی۔ اس دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا، جن پر ارتداد کا الزام ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ نظامِ تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ ''سو بے گناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص الحاد کرے۔'' اس قاعدے کے مطابق وہ کم سے کم شبہہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے۔ اور کسی کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور تفتیش کا کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول نہ کرتا تھا۔ پوپ 'انوسنٹ' ہشتم نے سنہ ۱۴۸۴ء میں یہ اعلامیہ شائع کیا کہ طاعون آندھیاں دراصل جادوگروں کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ ایسے لوگوں کو تلاش کرو اور جہاں ملیں ان کو خوب زد و کوب کرو اور قتل کر دو۔ پوپ کے اس اعلامیہ پر خصوصیت کے ساتھ 'انگلستان' اور 'اسکاٹ لینڈ' میں زیادہ شدت کے ساتھ عمل کیا گیا۔

بارھویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دُنیا سے اہلِ یورپ کی عقلوں کے لیے ایک نئی روشنی پہنچی تاکہ اُنہیں ان بندشوں اور بندھنوں سے آزاد کرائے، جن میں وہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں عربوں کے واسطے سے 'ارسطو' کے فلسفے کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ اہلِ یورپ کی عقلوں کو آزاد کرانے میں 'ابنِ رشد' اور ایسے ہی دوسرے فلاسفۂ اسلام کا بڑا حصہ ہے، اور ان کی تعلیمات کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پوپ 'یوحنا' یازدہم 'ابنِ رشد' کی تعلیمات کی حددرجہ مذمت کرتا تھا اور اس کے وجود اور اس کی اشاعت کو نہایت مضر بتاتا تھا۔ جنوبی اطالیہ میں سینٹ 'تامس اکون' نے سنہ ۱۲۷۳ء میں 'ارسطو' اور مسلمانوں کے فلسفے کے مقابلے کلیسا کے لیے ایک فلسفہ وضع کیا، جس پر رومن کیتھولک چرچ اب تک قائم ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفے میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی، بلکہ وہ اس کو تنکے کی مانند ہوا میں اس طرح اُڑائے لیے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھہر نہیں سکتا۔

مورخوں کا اس پر اجماع ہے کہ یورپ میں فکری حرکت اور علمی نہضت (ترقی)، بارھویں صدی مسیحی کے قریب، دو رستوں میں داخل ہوئی۔ ایک وہ تصادم جو دو صدیوں تک

صلیبی جنگوں کے زمانے میں فرنگی قوموں اور اسلامی مشرق کے درمیان برپا رہا۔ دوسرے وہ معاہدِ علمیہ (علمی ادارے) جو عربوں نے 'اندلس'، 'نیلز' اور 'صقلیہ' میں قائم کیے۔ محقق مورخوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمی کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً 'راجر بیکن' وہ عربی و لاطینی دونوں زبانیں جانتے تھے اور لاطینی میں قریب قریب ہر فن کے متعلق عربوں کے علوم و مباحث منتقل ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد و ابداع کے شرف کا دعویٰ کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اُنہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل اُنہوں نے اخذ کیے اور ان کو اپنا بنا کر پیش کر دیا۔ ائمہ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریز راہب 'راجر بیکن' نے، جس کی طرف اہلِ فرنگ عدسات و مناظر (Optics) میں سبقت کا شرف منسوب کرتے ہیں، یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کیے تھے، جو طبیعیات اور خصوصاً علمِ نور و بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے۔ پس وہ لوابردارنِ قرآن ہی تھے، جن کے ساتھ ربط و تعلق نے اہلِ یورپ کی آنکھیں کھولیں، ان کی بصیرت سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا۔ اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقل پر ہوتے جس پر نورِ قرآن سے بہرہ مند مشرق فائز تھا، تو عربی تہذیب و مدنیت اور اسلامی حریتِ فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد ان کی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی۔ لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت اس قدر حاوی تھی اور مسیحی دُنیا کی عقلیں کچھ اس طرح ان کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھیں کہ اسلامی استنارۂ فکر کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے، جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا۔ اس کا رُخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف موڑ دیا اور کلیسا کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا، اور اس طرح اس کی غایت طبیعی تک اس کو نہ پہنچنے دیا۔

۱۵۲۹ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا ہے کہ تمام مجادلوں سے پرہیز کیا جائے، اور تورات و انجیل کی تفسیر بجز اس طریقے کے جو کلیسا نے مقرر کر دیا ہے کسی اور طریق پر نہ کی جائے۔ اس حکم نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلا دی

تھی، اور یہ حکم من جملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا، جن کے باعث پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اسی پروٹسٹنٹ مذہب کے بانی 'لوتھر' نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کرسکتی ہے جسے وہ صحیح سمجھتی ہو، اور اسے حق ہے کہ ملحدوں اور اس عقیدے کے منکروں کا استیصال کر دے۔ اسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنھوں نے ایک مدت تک فکری حرکت کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخر کار سولھویں صدی کے اواخر میں 'انگلستان' کا فلسفی 'فرانسس بیکن' ظاہر ہوا، جس نے مذہبی فلسفے پر زبردست حملے کیے اور اس کے سنگین قصد کو دلائل کے تیشوں سے مسمار کر دیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی دعوت دی اور علمی مسائل پر نئے ڈھنگ سے بحث کرنے کی طرح ڈالی۔ علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہ نمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدیدِ علمی و تجریدِ عقلی کا وہ دَور شروع ہوا، جس کے ثمرات سے اب تک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں فلکیاتِ جدید کی تاریخ کی ابتدا ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب 'کوپرنکس' (Copernicus) کی کتاب شائع ہوئی، جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کی گردش کا مسئلہ ثابت کیا تھا۔ پھر 'گلیلیو' (Galileo) نے اپنی دُوربین کے ذریعے مریخ کے چاند ثابت کیے، اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ پھر کلیسا نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری ۱۶۱۶ء میں مکتب مقدس نے فیصلہ کیا کہ 'کوپرنکس' کا مذہب نہایت رکیک ہے۔ اسے مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھہرایا گیا، اور اٹھارھویں صدی مسیحی کے وسط تک 'روما' نظامِ شمسی کی تعلیم سے محروم رکھا گیا۔ اس ممانعت نے 'اطالیہ' میں علومِ طبیعیہ کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اسی طرح پوپ 'الگزنڈر' نے ۱۵۱۰ء میں مطابع پر نگرانی قائم کر دی، تاکہ ایسے آزاد خیالات، شائع نہونے پائیں، جن کو کلیسا پسند نہ کرتا ہو، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں۔ 'فرانس' میں 'ہنری دوم' نے اس شخص کے لیے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت چھاپے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصے میں مطابع (پریس) کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ یہی زمانہ ہے

جس میں کلیسا کا اقتدار ضعیف ہوا۔ اور ملوک و امراء مدنیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظام و قوانین کا چرچا ہوا۔ 'فرانس' میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی (۱۷۹۲ء) تو 'پوپ' کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کلیسا کے خلاف زبردست حرکت (تحریک) شروع ہوئی۔ 'پیرس' میں تمام معاملہ کو بلا استثناء بند کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ پھر جب 'روبس پیز' (Robespierre) برسرِ حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا، جس کا نام دینِ فطرت تھا۔ اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعراء مثلاً Voltaire وغیرہ کا مذہب تھا۔ اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقائے روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت و انسانیت و رحمت کو شیوہ بناؤ۔ ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان و مذاہب سے کش مکش برپا ہو جائے گی۔ اس نئے مذہب کو دینِ محبتِ الٰہی (The Ophilanthropy) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر ۱۸۰۱ء میں 'نپولین' نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آ گئی۔ اس حرکت سے 'نپولین' کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ روحانی اقتدار سے فائدہ اُٹھائے اور آئندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے، اور کیتھولک دُنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہو گیا کہ اس زمانے میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور اناجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے، جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے انکارِ وحی کا خیال پیدا ہو گیا، اور جگہ جگہ علمی مناقشے ہونے لگے۔ انیسویں صدی میں قدیم رسوم و عقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے، اور ان میں سے اکثر کی جڑیں اکھیڑ پھینکی گئیں۔ اگرچہ اس زمانے کے علماء میں خود بھی باہم اختلاف تھا۔ بعض ان تقلیدوں کے علانیہ منکر تھے۔ اور ان کو غیر معقول و رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہنچے تھے۔ فرانسیسی عالم 'پاسکل' (Pascal) ان پر ایمان رکھتا تھا۔ انگریز فلسفی 'بیکن' ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف 'ڈے کارٹ' (Rene Descartes) کوشش کر رہا تھا کہ عقل اور

کلیسا میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانے میں بسا اوقات ہمیں کلیسا پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جادوگروں کے معاملے میں یا تو ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ سنہ ۱۷۱۲ء میں جیمس اوّل انجیل کی آیت ''تو جادوگروں کو زندہ نہ چھوڑ'' کے مطابق عمل کر کے ان کے ساتھ سختی سے پیش آ رہا تھا، یا دوسری طرف ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ 'ہرٹ فورڈ شائر' کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کا مستحق قرار دیتی ہے، لیکن جج اس کی رائے کو قبول نہیں کرتا، اور کلیسا کی تعلیمات اور عام رسم کو نظرانداز کر کے اس کو رہا کر دیتا ہے۔ اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون سنہ ۱۷۳۵ء میں منسوخ ہوا، لیکن اس کے بعد ہی ۱۷۵۲ء میں 'اسکاٹ لینڈ' کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی کہ وہ جادوگرنی ہے۔

قابلِ ذکر فلسفی مذاہب میں سے ایک وہ ہے، جس کا مؤسس ہالینڈ کا یہودی فلسفی 'اسپی نوزا' (Spinoza) تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے، جو اپنی ذات سے قائم ہے، اور یہ کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد نہیں ہے۔ اور علتِ اولیٰ یا علتِ العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے۔ بہ لفظ دیگر وہ وحدت الوجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ کلمہ سترھویں صدی اور اٹھارہویں صدی میں آزاد مفکروں کے رموز میں سے تھا، کیوں کہ اس پر عام غیظ و تکفیر کا طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں جتنے لوگ آزاد خیال کہے جا سکتے تھے، وہ سب کے سب آلٰہیین تھے، جو خدا پرستی کے قائل تھے، لیکن وحی کے قائل نہ تھے۔

'اسپی نوزا' کے معاصروں میں سے ایک 'لوک' (Locke) ہے، جس کی کتاب "Essay on the Human Understanding" کا لبِ لباب یہ ہے کہ علم کلیتہً تجربات کا نتیجہ ہے۔ ہر حال میں اعتقاد کو حکمِ عقل کے تابع ہونا چاہیے۔ جو بات حکمِ عقل کے خلاف ہو، اس کو ماننے سے انکار کر دو، خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو۔ جو علم صحیح نظرِ عقلی سے حاصل ہوتا ہے، وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے موافق بنانے کے لیے بھی لکھی تھی۔ اسی ڈھنگ پر اس کا معاصر 'بایل' بھی چلا، جس نے فرانس سے جلائے وطن ہونے

کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی "Phylosophical Dictionary" مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ ''خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو؟'' ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ الاھیین کے لیے آرتھوڈکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا محال ہے، جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جب آرتھوڈکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہو گئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الاھیین اور 'اپی نوزا' اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے۔

سترھویں صدی کے آخر تک الاھیین کے خیالات پوشیدہ رہے۔ پھر جب قوانینِ مطبوعات منسوخ ہوئے تو اُنھوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ لیکن پوری آزادی اب بھی نہ تھی، کیوں کہ چند مزاحمتیں اب بھی باقی تھیں۔ مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے، یا اُن کی پیروی کے خلاف رائے ظاہر کرے، یا مسیح پر حرف گیری کرے، اس کو قید کر دیا جائے۔ 'انگلستان' کے لارڈ چیف جسٹس 'ہیل' (Sir Mathew Hale) نے سنہ ۱۶۷۶ء میں قانونِ عامہ کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کلیسا کی تعلیم کے خلاف ہو، قانونِ عامہ کے خلاف سمجھا جائے گا، کیوں کہ نصرانیت انگریزی قانونِ عامہ کے ارکان میں ہے۔ سنہ ۱۶۹۸ء کے قانونِ عامہ میں یہ توضیح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لیے کلیسا کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔ جو کوئی ایسا کرے گا، اس کو پہلی مرتبہ حکومت سے برطرفی کی سزا دی جائے گی، اور دوسری مرتبہ عام مدنی حقوق سے اس کو محروم کر دیا جائے گا۔

اٹھارہویں صدی میں وال ٹیر اور 'روسو' (Rousseau) نے آزادئ فکر کی تحریک کا بیڑا اُٹھایا۔ 'روسو' کی کتاب 'امیل' (Emile) علانیہ 'پیرس' میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مولف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ 'پروشیا' کے بادشاہ 'فریڈرک' کے سوا، سارے یورپ میں کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے رہے، یہاں تک کہ اس کو 'پروشیا'

سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔ 'روسو' نے اپنی کتاب 'العقد الاجتماعی' (Social Contract) میں جو اشتراکی نظریے بیان کیے ہیں، ان کا حیاتِ اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن یہی کتاب اس زمانے میں 'جنیوا' میں علانیہ جلائی گئی۔

سنہ ۱۷۷۰ء میں جس دِن 'ہیرن دی ہول باخ' (Holbach) کی کتاب 'نظامِ طبیعیہ' (System of Nature) شائع ہوئی؟ جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو سارے فرانسیسی ناظرین مضطرب ہو گئے۔ غرض اٹھارہویں صدی میں اگرچہ اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی، لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب اور آزاد خیالی میں کش مکش برپا رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۱۹ء میں جب 'کارلائل' کی کتاب العصر العقل (The Age of Reason) شائع ہوئی تو 'کارلائل' کو تین سال قید کی سزا دی گئی، پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی اور بیٹی اور بہت سے کتاب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارہویں صدی کے وسط تک اہلِ یورپ کی عقلیں قدیم تقلیدوں کی بندشوں میں بری طرح جکڑی رہیں۔ اس زمانے میں کیفیت یہ تھی کہ 'فریڈرک' شاہ پروشیا کے باپ نے فیلسوف 'وولف' (Wolfe) کو صرف اس جرم میں ملک بدر کر دیا کہ اس نے 'کن فیوشس' کے مذہب کی ستائش کی تھی۔ گویا اس کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کا حق ہی نہ تھا۔ لیکن اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو ان سب لوگوں کے لیے پناہ گاہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریتِ فکر کی بنا پر ہدفِ ظلم وستم بنائے جاتے تھے۔ ۱۷۸۱ء میں کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب نقد العقل الصحیح (Critic of Pure Reason) لکھ کر دنیا بھر میں ہل چل برپا کر دی۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنی دلیلیں قائم کی گئی ہیں، وہ سب باطل ہیں۔ اور دعویٰ کیا کہ علم کے لیے تجربے کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے۔ لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الٰہیت کے انداز میں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیاتِ اجتماعی میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

جس کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی اساس و اسلوب اختیار کیا جائے اور آسمانی مصادر سے استناد کیا جائے۔

(۲)

خطبۂ دوم

حضرات!

گذشتہ خطبے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بلادِ مغرب میں علومِ جدید کا مرجع سترھویں صدی ہے، جس میں 'کوپرنکس' کے نظریے اور نظریۂ جذب و کشش اور نظریۂ دورانِ خون اور کیمیا و طبیعیات کے جدید قوانین کا ظہور ہوا۔ اور لوگ سیاروں کے نظام اور تاروں کی کنہ، اور ٹوٹنے والے تاروں کی کیفیت سے واقف ہوئے۔ لیکن انیسویں صدی تک یہ اکتشافات ان غامض (گہرے) مسائلِ کونیہ کی تفسیر سے قاصر رہے جو بائبل کے عہدِ جدید اور عہدِ قدیم میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور اگر اس سلسلے میں کچھ کوشش ہوئی بھی تو وہ بہت محدود تھی۔ پھر جب ان اکتشافات کی بنا پر مسائلِ کونیہ کی بحث شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُن تاریخی روایات کی بحث بھی شروع ہوگئی جو ان کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً طوفانِ نوح اور سفرِ تکوین۔ اس صدی کے اوائل میں 'لاپلاس' (Laplace) آیا اور اس نے ظاہر کیا کہ سفرِ تکوین میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ ہمیں وجودِ خالق کے نظریے سے انکار کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر علمِ طبقات الارض کی تحقیقات نے ترقی کی اور اس نے ایسے مفروضات پیش کیے، جو سفرِ تکوین اور قصۂ طوفان سے متناقض تھے۔

۱۸۶۳ء میں پروفیسر لائل (Lyell) نے اپنی کتاب 'قدم الانسان' میں بیان کیا کہ انسان اس مدت سے بہت پہلے زمین پر آباد ہو چکا تھا، جو 'تورات' نے مُعین کی ہے۔ لیکن اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان دونوں متناقض بیانات میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ شاید 'تورات' میں جو مدت بیان کی گئی ہے، اس کے دن بہت زیادہ طویل ہوں اور ہمارے دنوں کی طرح ہوں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی تطبیق ان ایام پر نہیں ہو سکتی جن میں

انسان پیدا کیا گیا ہے۔ کیوں کہ 'تورات' کے بیانات سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ وہ دِن ایسے ہی تھے، جیسے ہمارے موجودہ زمانے کے دِن ہیں۔ بہرحال، اس عہد کے فلاسفہ میں عام خیال یہ پھیل گیا تھا کہ علمِ طبقات الارض نے 'اناجیل' کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنے کے لیے دروازہ کھلا ہوا تھا کہ نوعِ بشری کا وجود تاریخ سے پہلے کی بات ہے۔ اور لوگ اسی مذہب پر تھے کہ علم الحیوان نے اصل الانسان کے متعلق ایک نئی تحقیق پیش کر دی، اور انسان پر قانونِ نشوِ ارتقا اور تمام قوانینِ طبیعی کو منطبق کر دیا۔ خصوصاً جب سے ڈارون کی کتاب 'اصل الانواع' (Origin of Species) شائع ہوئی ہے (۱۸۹۵ء)، اس کو حقائقِ ثابتہ میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

۱۸۷۱ء میں جب 'ڈارون' کی کتاب 'منشاء الانسان' (The Descent of Man) شائع ہوئی تھی، اسی وقت سے ایک فکری شورش برپا ہوگئی تھی، اور دینی و غیر دینی طبقوں کے درمیان جدال و نزاع کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ حتیٰ کہ 'گلیڈ اسٹون' کے متعلق مشہور ہے کہ اسی زمانے میں اس نے کہا تھا کہ

''اگر ہم نظریۂ نشو و ارتقاء کو مان لیں تو اس کے اعتبار سے خدا کی یہ حیثیت رہ جائے گی کہ وہ ایک خالق تھا، جس کا کام ختم ہوگیا۔ اور اگر قوانینِ کونیہ کے علومِ تفسیر کو مان لیا جائے اور یہ قرار دے دیا جائے کہ یہ قوانین ایک ہی حالت پر دائماً قائم رہنے والے ہیں تو دُنیا میں خدا کی حکومت کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی۔''

اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ صدی کے وسط تک مغرب کے غیر اسلامی ممالک میں مرکزِ عقل اور حریتِ فکر کا کیا حال رہا ہے تو اس کے لیے میں آپ کے سامنے صرف ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں، جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک انگریز کارڈی نل (Cardinal) کے اعلان کا یورپ میں کس طرح استقبال کیا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ

۱۸۶۴ء میں کارڈینل مانگ (Manning) نے اپنے ایک اعلان سے تمام عالمِ نصرانیت کو حیرت زدہ کر دیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہر انسان کو وہی اعتقاد رکھنا چاہیے،

جس کو وہ اپنی فکر ونظر کی بنا پر صحیح سمجھتا ہو۔ اور یہ کہ کلیسا کو عقیدے پر مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور یہ کہ اُمورِ ماوراء طبیعہ کا علم ممکن ہے، بلکہ اس علم کو تنہا وحی اور کلیسا کی رغبتوں ہی کا پابند ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ کیتھولک فرقے کے لوگوں کو حق ہے کہ دوسری ملتوں سے نکل جانے والے لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں، اور اُنھیں حق ہے کہ اپنی نماز بلند آواز سے پڑھیں۔ اور یہ کہ یورپ علمی ترقی اور حریت و مدنیت کے ساتھ بسلامت رہ سکتا ہے۔''

دیکھیے تو سہی کہ مورخوں نے اس اعلان کو ان بڑے حوادث میں شمار کیا ہے، جنھوں نے عالمِ نصرانیت کو حیرت زدہ کر دیا۔ حالاں کہ بنظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کارڈی نل نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا ہے، جو عالمِ اسلامی کو اس وقت سے معلوم ہیں، جب سے قرآن کا نور دِلوں پر تاباں ہوا ہے۔ اور اس کی وہ فطری تعلیمات عالمِ انسانی پر جلوہ فگن ہوئی ہیں جو غور وفکر کو لازم کرتی ہیں، کورانہ تقلید کو قبیح ٹھہراتی ہیں، اور عقلوں سے پردے اُٹھا دیتی ہیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کئی صدیوں تک فکرِ بشری اور مغربی ملتوں کے درمیان کیسی شدید نزاع اور پیہم اکھیڑ پچھاڑ برپا رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار عقل کے غالب آ جانے اور حریتِ فکر کے فتح یاب ہو جانے کے آثار پیدا ہو گئے۔ ''آثار پیدا ہو گئے'' ہم نے اس لیے کہا کہ اب بھی ہمیں یورپ کے بعض ممالک، بلکہ 'امریکا' کی دنیائے جدید میں ایسے لوگوں کی کمی نظر نہیں آتی جو قدیم تقلیدوں کی حمایت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے باپ دادا کے اعتقادات تھے، ان پر جمے رہنے پر اڑے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ تقلیدیں اور وہ اعتقادات عینی مشہودات سے معارض اور منطقی حجتوں سے متناقض ہی کیوں نہ ہوں۔ کیا آپ بھول گئے کہ گزشتہ سال ہی 'امریکا' کی ایک جامعہ نے اپنے پروفیسروں میں سے ایک نامور پروفیسر کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ جب اس نے 'ڈارون' کے مذہب کی تبلیغ کی تو اس کے خلاف شور برپا ہو گیا، اور وہ شور اس وقت تک فرو نہ ہوا جب تک کہ اس پروفیسر کو اس جامعہ کی کرسی سے الگ نہ کر دیا گیا۔

حضرات!

جہاں تک ممالکِ غربیہ کا تعلق ہے، یہ مختصر بیان ان حالات کی صورت کشی کے لیے کافی ہے جو گزشتہ کئی صدیوں کے دوران میں عقلِ بشری کو پیش آ رہے ہیں، اور اُن آلام و مصائب کا اندازہ کرنے کے لیے یہ تھوڑا سا خلاصہ ہی کافی ہے، جن کا مقابلہ عقل کو اپنی حریت اور اپنے استدلال کی خاطر ممالکِ مغربی میں کرنا پڑا ہے۔ آیئے، اب ہم ایک نظر مشرق پر بھی ڈال کر دیکھیں کہ جس وقت ممالکِ یونانیہ میں حریتِ فکر کی پَو پھٹ رہی تھی (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا پس و پیش زمانہ) اس وقت بلادِ مشرق میں عقل کا کیا حال تھا۔ جب مشرق ادنی میں 'اکسینو فانیس' (Xenophanes) یونانیوں کے دیوتاؤں پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر کے اور ان کا مذاق اُڑا کر لوگوں کو ان کی عبادت چھوڑ دینے کی دعوت دے رہا تھا؟ اور جس زمانے میں 'ہرقلی نوس' اور 'دی موق ری توس' عقولِ بشری کو جاہلی تقلید کی بندشوں سے نجات دِلانے کی کوشش کر رہے تھے، اور ان کو ملکوتِ ارض و سما پر غور کرنے کی تعلیم دے رہے تھے، ٹھیک اسی زمانے میں (ہمیں) مشرق کے دوسرے کنارے پر ایسی عقل و نفسی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں، جن کا مقصد خوابیدہ ہمتوں کو بیدار کرنا، اور جاہل و گم راہ قوموں کو غور و فکر کی راہ دِکھانا، اور ان کو اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل کی تحقیق و تفتیش پر آمادہ کرنا تھا۔ ہندوستان میں 'بودھ' اپنی تعلیمات کے ساتھ نمودار ہوتا ہے؟ اور چین میں 'کن فیوشس' معاشرتی طبقوں کی اس درجہ بندی اور اس سیاسی و اجتماعی فوضویت (انتشار) کے خلاف جنگ کرتا دِکھائی دیتا ہے، جس میں اس کے زمانے کی چینی قوم اور مملکتِ چین کے اربابِ حکومت مبتلا تھے۔ اور اُس سنگ دلی، درشتِ خوئی، جور و ظلم اور غلام گری کی اصلاح کرتا نظر آتا ہے جو اس کے عہد میں امراء کی امتیازی صفات تھیں۔

یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اگرچہ مشرق کے یہ دونوں علاقے اپنے زمانۂ نہضت (ترقی) میں متحد اور اس نہوضت کی کنہ و طبیعت میں متشابہ ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ 'ہندوستان' میں اس کی توجہ عامِ مادی زوال کی بجائے زیادہ تر نفس کو اخلاقِ فاسدہ کی نجاستوں سے پاک

کرنے کی طرف مائل رہی، اور 'چین' میں 'کن فیوشس' نہضت (انقلاب) کا اوّلین مقصد یہ رہا کہ سیاسی و اجتماعی زندگی کے مادی مظاہر کو منضبط کرنے میں دستور مقرر کیے جائیں، اور ان کو ایک نظم کے تحت لایا جائے۔

بزرگو! جس طرح مشرقِ ادنیٰ اور بلادِ غربیہ میں مذہبی پیشوائی کے مدعیوں نے ان بدعات و مظالم، اور ان ناروا بندشوں اور عبادت کے ان غلط طریقوں کو رواج دیا، جنھوں نے خدا کے بندوں کو تکلیف میں ڈالا اور ارواحِ بشری کو ہلاکت کے غار میں جھونکا، اور عقولِ انسانی کو غلامی کی قیود میں جکڑا، اسی طرح 'چین' اور 'ہندوستان' اور دوسرے ہمسایہ ملکوں میں بھی ان کے ہم پیشہ لوگوں نے یہی سب حرکتیں کیں، اور ان کی بدولت قرونِ وسطیٰ دُنیا کی تاریخ میں بدترین قرون بن گئیں۔ آخر کار علیم و حکیم کی حکمت، اور رفیقِ رحیم کی رحمت اس کی مقتضی ہوئی کہ اپنے ظلمت و ضلالت میں بھٹکنے والے اور جہالت کی وادیوں میں حیران و سرگرداں پھرنے والے بندوں پر نورِ معرفت کا اشراق فرمائے، تاکہ ان کی عقلوں کے بند کھل جائیں۔ اور ان کے نفوس کی منزلت بلند ہو جائے۔ اس نے اُنہیں محض ناکام تجربوں کی رہ نمائی پر نہیں چھوڑا، بلکہ ان کو رہائی دِلانے اور راہِ راست دِکھانے کے لیے وحی نازل فرمائی تاکہ وہ ان مجادلات و مصادمات سے بچ جائیں، جس میں دوسری ملتوں اور مذہبوں کے لیے لاکھوں طالبانِ عدل و حریت فنا ہو چکے تھے۔ اس کی حکمتِ بالغہ نے یہ چاہا اور اسی لیے اس نے قرآنِ حکیم کو دینِ فطرت کے ساتھ نازل فرمایا، تاکہ قید و بند میں جکڑے ہوئے نفوس کو اس کے پاک احکام کے ذریعے آزاد کرادے۔ اور گم راہ عقلوں کو جہالت کے مہلکوں سے نجات دلائے۔

اب میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں، اس سے آپ حضرات کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم نے کس طرح حریت کی راہ میں فکرِ بشری کی ہدایت فرمائی ہے، اور وہ عقل کو کن بلند منزلوں تک اُٹھا لے گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مناسب ہوگا کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اُٹھا کر اس سوال کو بھی حل کر دیں جو بعض لوگوں کے دِلوں میں کھٹکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب قرآن کا دین دراصل دینِ فطرت ہی ہے، اور جب احکام کی صحت کا قیاس قرآن کے نزدیک عقل اور

منطق ہی ہے، تو پھر دین کے بذریعۂ وحی نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ کیوں عقلِ بشری کو حق اور حقائق کی راہ میں مجاہدہ کرنے میں تنہا نہ چھوڑ دیا جائے، تاکہ وہ خود ان تک پہنچے، اور خیر و شر اور نافع اور ضار کی بحث و تنقیب سے خود ان کی کنہ کو سمجھے اور ان کے حدود کا ادراک کرے اور ان کے درمیان جو مابہ الفرق و الامتیاز امور ہیں، ان کو پہچانے؟

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ بلاشبہ انسانی عقل کے لیے یہ ممکن ہے کہ بحث و تنقیب اور تجربوں کے ذریعے احکام و تصورات اور نظمِ اجتماعی اور مسائلِ علمی اور آدابِ خلقی کے ان مراتبِ کمال تک پہنچ سکے، جن میں نفسِ انسانی فطری شوق رکھتا ہے۔ لیکن اس راہ میں دو گھاٹیاں ہیں، بہت ہی دشوار گزار، جن کو عبور کیے بغیر اس آرزو کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک عادی ہے اور دوسری طبیعی۔

پہلی گھاٹی یہ ہے کہ نفسِ بشری اپنی حقیقی مصلحت کی خاطر جن وجوہِ صواب کی جستجو کرتا ہے، ان تک پہنچنے میں صدیوں کے تجارب اور تحقیقات درکار ہے۔

دوسری گھاٹی ناموسِ نشو و ارتقا یعنی تدریجی ترقی کی گھاٹی ہے، جس کی وجہ سے عالمِ معقولات و معنویات میں عقلِ بشری کسی آگے کے مرحلے پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ اس سے پہلے کے مرحلوں کو طے نہ کر لے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو تحقیق و بحث کی راہ میں عقل کی پیش قدمی کو روکتے ہیں اور ایسی رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں جن سے بچ کر بہت ہی کم عقلیں نکل سکتی ہیں، ورنہ اکثر و بیشتر تو ٹھوکر کھاتے ہی گر جاتی ہیں، ان عوامل میں سب سے زیادہ اہم عامل وہ نفسی انفعالات اور عصبی اضطرابات ہیں، جن کے آثار ہماری اجتماعی و عقلی اور ادبی زندگی کے شعبوں میں اس قدر نمایاں ہیں کہ کوئی شخص ان سے ناواقف نہیں ہے۔ یہ بہت ہی سخت مغالطہ ہوگا اگر ہم اپنے افکار و احکام میں میلانات میں کمال کو پہنچنے اور نقائص سے بری ہونے کا ادعا کریں؟ دراں حالے کہ ہمارے اندر ایک نفسِ امارہ اور ہمارے پہلو میں ایک متلون قلب موجود ہے، اور ہم اکثر معاملات میں اپنی خواہشوں کی اطاعت اور ہوا و ہوس کی فرماں برداری کیا کرتے ہیں۔

ان وجوہ سے، اور اس لیے کہ لوگوں کو سب سے قریب کے اور سب سے زیادہ سیدھے اور سب سے زیادہ محفوظ رستے پر چلایا جائے؟ خالقِ کائنات اپنی مخلوق میں سے پاکیزہ ترین مخلوق کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجتا ہے۔ کیوں کہ اپنے بندوں پر اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لغزشِ قدم اور پریشان خوابی، اور نفس کی خواہشوں کے فتنے سے ان کو بچائے۔ اور ان کے سیکڑوں ہزاروں برس اس علم، اس حریت اور مساوات، اُس عدل وقسط، اور ان تمام فضائل وکمالات کی تلاش وجستجو میں ضائع نہ ہونے دے، جن کے لیے ان کے نفوس فطرۃً آرزومند رہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم ہر چیز میں دینِ فطرت لے کر آیا ہے۔ اس کے قواعد، احکام اور اصولِ آداب وشرائع پوری طرح فطرتِ بشری کے مقتضیات (تقاضوں) سے مطابقت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی لائی ہوئی شریعت کے امہاتِ اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو اُمور مؤثرات کی تاثیر سے متاثر ہوتے ہیں، اور جن میں اختلافِ حالات کے ساتھ پے در پے تغیرات واقع ہوتے ہیں، ان میں ہر قوم کے عرف کا لحاظ کیا جائے گا۔ اس وجہ سے زمان ومکان کے اختلافات اور مختلف قوموں کے مخصوص 'عرف' کے لحاظ سے شریعت کے فرعی وجزئی مسائل میں اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح قرآنِ حکیم مطالبِ عقل کے عین مطابق ہے اور انسانی فطرت سے ناآشنا نہیں ہے۔ اور حیاتِ اجتماعی کے شعبوں میں سے کسی شعبے میں طبیعت بشری کے سلطان وآثار سے اعراض نہیں برتتا۔

پھر قرآن اس سے خوب واقف ہے کہ انسان اپنے احساس وشعور کی ابتدائی حالت ہی سے ان واقعات وحالات کی علتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، جن کا ادراک اسے اپنے حواس کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اور یہ تلاش وجستجو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس لیے وہ اس کی اس فطرت کو اور زیادہ ابھارتا اور اسے بحث وتحقیق کے لیے نئے گوشے دکھاتا ہے۔ اور بار بار ان جامد طبیعتوں کو متنبہ کرتا رہتا ہے جو کورانہ تقلید کے تنگ دائروں میں اس قدر مقید ہوگئے ہیں کہ ان سے نکل کر وسعتِ نظر کے ساتھ کائنات اور اس کی خلقت پر نگاہ نہیں ڈال

سکتے۔ اس باب میں قرآنِ مجید نے تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے اور کوئی حجت اور کوئی برہان ایسی نہیں چھوڑی جو اس نے حریفانِ حق پر قائم نہ کی ہو۔

اور یہ جو قرآن نے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور اس کے ساتھ ان احکام و شرائع اور آداب و فضائل کو قبول کرنے کا حکم دیا ہے جو انبیائے کرام نے پہنچائے ہیں تو یہ ہرگز عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ عقل جس طرح فطرۃً اس چیز کی حاجت کا شعور رکھتی ہے، کہ وقتاً فوقتاً افراد اور جماعتوں کے ظلم و تعدی کو افراد اور جماعتوں ہی کے ذریعے دفع کیا جاتا رہا ہے۔ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ (البقرۃ:۲۵۱) اسی طرح اس کی فطرت ہی اُسے اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وہ ان سب چیزوں کو قبول یا وضع کرے، جن میں اس کو نظامِ حیاتِ اجتماعی کی صلاح و فلاح نظر آئے۔ اور چوں کہ انسانی عقل، تشریعی و ادبی اور علمی شعبوں کے معاملے میں نارسائی، لغزش اور قلتِ وسائل کے خطرات سے دو چار ہے (جس کی تفصیل ایک دوسرے موقع پر بیان ہو چکی ہے)۔ اس لیے وہ طبعاً اس طرف مائل ہے کہ کسی پر بھروسا کر کے اطمینان و سکون حاصل کرے۔ اور کسی ایسی بات کو قبول کر لے جس کے بعد اس کو بحث و تنقیب کی مشقت نہ اُٹھانی پڑے۔ اور کسی ایسے ماہر کامل کو اپنا رہنما بنا لے جو اس کو ظنون و تجربات کی راہ میں پیش آنے والے خطرات و مہالک سے بچا لے جائے۔ پھر اس اعتماد و قبول کے لیے اس کی نازل کردہ وحی سے زیادہ مستحق اور کیا چیز ہوگی جو انسان اس کی فطرت و طبیعت کے تمام اسرار پر محیط ہے اور ان سب اُمور کا عالم ہے، جن میں اس کی صلاحِ شان و سعادت مضمر ہے؟ مزید برآں انسان فطرۃً اپنے مطلوبات تک پہنچنے کے لیے سب سے قریب کا رستہ چاہتا ہے، اور یہی خواہش اس کو کسی ایسے رہنما کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے، جس پر وہ اعتماد کر سکے، اور جس کی ہدایتوں پر وہ اطمینان و سکون نفس کے ساتھ چل سکے۔ پس نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی جس کثرت کے ساتھ بعض افرادِ انسانی پر اعتماد و اعتقاد رکھنے کے حاجت مند ہیں، اور انبیاء و رسل اور ان کے پیرو داعیوں پر ایمان لاتے ہیں، اس کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ ان کی رہ نمائی سے بآسانی منازلِ کمال تک

پہنچنے اور ان کی ہدایت سے سعادت وسلامتی کی زندگی بسر کرنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ انسان طبعاً اس ایمان واعتقاد پر مائل ہے، اس لیے کہ وہ فضائل کی معرفت میں درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے گھبراتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس قسم کی تدریجی طلب کرنے والا بسا اوقات صواب کی منزل تک نہیں پہنچتا۔ اور اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ سلامتی کے ساتھ اس راہ سے گزر جائے گا۔ وہ متفرق اعمال وتصرفات اور احکام کے برے عواقب میں پڑنے سے فطرۃً بچنا چاہتا ہے، اس لیے اس کی فطرت ہی اس کو نجات کی خوش خبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے داعیوں کی دعوت قبول کرنے کی طرف مائل کرتی ہیں، اور اسے اُمید دِلاتی ہیں کہ اس کا مطلوبِ گم کردہ، جس کو اگر وہ خود اپنی کوشش سے طلب کرے تو شاید نہ پا سکے، غالباً اس طریقے سے مل جائے گا، جس کی طرف وہ لوگ دعوت دے رہے ہیں۔

پس انسان کی فطرتِ سلیمہ اور اس کی آزاد عقل ہی اسے ایک ایسے ہادی اور رہنما پر اعتقاد رکھنے اور مطمئن ہو جانے میں آمادہ کرتی ہے جو اسے خطا ولغزش اور گم راہی سے بچا کر سلامتی کی راہ پر لے جانے والا ہو۔ اور اسے خوف دِلاتی ہے کہ اگر اس نے خود اپنے دلائل اور خود اپنی قوتوں پر اعتماد کیا تو عین ممکن ہے کہ کہیں ناواقفیت اور فکر کی غلطی اور قدمِ سعی کی لغزش سے وہ اُن بہت سے اعلیٰ مطالب اور پاکیزہ رغائب تک پہنچ نہ سکے گا، جن تک پہنچنے کی خواہش اس کے نفس میں پنہاں ہے۔ اسی فطرت کے اقتضا سے مدرسے قائم کیے جاتے ہیں۔ تہذیبِ نفس وتہذیبِ عمل سکھانے والی جمعیتیں بنائی جاتی ہیں، اور مذہبی پیشواؤں اور روحانی استادوں کی طرف ہر زمانے میں ہر طبقے اور عمر کے لوگ رجوع کرتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عقل کو حرکت میں لانے اور فکر کو آزاد کرنے کا کوئی وسیلہ ایسا نہیں ہے جس کو قرآنِ حکیم نے اختیار نہ کیا ہو۔ وہ جب کسی معیار پر فیصلہ چھوڑتا ہے تو وہ معیار عقل ہی ہوتی ہے۔ اور جب کوئی حجت قائم کرتا ہے تو وہ حجت حکمِ عقلی پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ اور جب کسی پر اظہارِ غضب کرتا ہے تو موردِ غضب وہی لوگ ہوتے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور جب کسی سے اظہارِ خوش نودی کرتا ہے تو وہ اہلِ عقل وخرد ہی ہوتے ہیں۔ قرآن نے جہاں

کہیں دوسری ملتوں اور مذاہب کے پیروؤں، اور مادئیین و دہریین سے مجادلہ کیا ہے، وہاں وہ برہان سے ان پرضرب لگاتا ہے اور بحث ونظر ہی کی طرف اُنھیں دعوت دیتا ہے، وہ کہتا ہے:

''لهم قُلوبٌ لَایفقهُون بِهَا وَلَهُم عَین لَایُبصِرُون بِهَا ولَهُم اٰذاٰن لایَسمعون بِهَا. اولئک کالَانعامِ بَل هُم اضلّ اولئک هُم الغَافِلُونَ.'' (الاعراف: ۱۷۹)

''وہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں، وہ آنکھیں رکھتے ہیں، مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ وہ کان رکھتے ہیں، مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ ہیں، وہی دراصل غافل ہیں۔''

ایسی بہت سی آیات ہیں، جن میں قرآن نے ان گمراہوں کو اس بنا پر زجر وتوبیخ کی ہے کہ اُنھوں نے اپنی عقلوں کو بے کار کر دیا ہے، یا باپ دادا کی اندھی تقلیدوں میں اتنا مقید کر دیا ہے کہ اگر آبائی طریقوں سے بہتر کوئی طریقہ پیش کیا جائے تو وہ اس کو محض اس بنا پر رد کر دیں کہ وہ ان کے باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے:

''واِذا قِیلَ لَهُم اتبعُوا مَا انزَلُ اللّٰهُ قَالُوا بَلَ نَتبَعُ مَا الفَینَا عَلینَا آباءَ نا اولو کان اباۤءُ هم لایَعقِلُون شیئا ولَایَهتدُون.'' (البقرة: ۱۷۰)

''اور جب کبھی ان سے کہا گیا جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو، تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ نہیں ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ انھی کی پیروی کریں گے، اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں، اور نہ راہِ راست پر رہے ہوں۔

اور جن آیات میں عقل سے کام نہ لینے والوں اور اندھے مقلدوں کو زجر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

ولَا تَقف مَا لَیسَ لکَ به عِلم، أنَ السَّمعَ وَالُبَصر وَالفؤاد کُل اُولئک کان عَنهَ مَسئولا (الاسراء: ۳۶)

اور جس بات کا تجھ کو علم نہیں، اس کے پیچھے نہ ہو۔ اور یقین رکھ کہ کان اور آنکھ اور دل سب سے قیامت کے دن پوچھ گچھ ہوگی۔

انّ شرَّ الدَّوابِ عِند اللّٰہِ الصُّمُ البُکُم الَّذِیْنَ لایَعقِلُو ن. (الانفال: ۳)

اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَمِنھُم مَن یَنظُر اِلیکَ افانتَ تَھدِی العُمیَ وَلَوْ کَانوا لایُبصِرُو ن. (یونس: ۵)

اور ان میں سے کچھ لوگ ہیں، جو تیری طرف نظر لگائے بیٹھے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو رستہ دِکھاؤ گے، چاہے ان کو کچھ بجھائی نہ دیتا ہو؟

پھر تم دیکھو گے کہ جہاں کہیں حریفانِ حق سے مجادلہ کیا گیا ہے، وہاں ہر آیت کا خاتمہ اس طرح کے فقروں پر ہوا ہے:

کَذلِکَ یُبَیّنُ اللّٰہُ لِکُم الآیتِ لَعلّکُم یَتفکّرُو نَ. (البقرۃ: ۲۶۶)

اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔

بَل اکثرھُم لایَعقِلُون. (العنکبوت: ۲۹)

بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو علم نہیں رکھتے۔

ان فِی ذَلکَ لآیتٍ لقومٍ یَتفکَرُو ن. (الروم: ۲۱)

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

قلیلا ما تَذَکّرُو ن. (النمل: ۶۲) تم کم ہی اللہ کی قدرت کو یاد کرتے ہو۔

ھَاتُوا بُرھانکم ان کنتُم صَادِقین. (البقرۃ: ۱۱۱) لاؤ اپنی دلیلِ قاطع، اگر تم سچے ہو۔

قَد فصّلنا الآیت لِقومٍ یَذَکّرُو ن. (الانعام: ۱۲۶) بے شک ہم نے نشانیاں واضح کر دیں، لوگوں کے لیے جو بیدار ذہن سے کام لیتے ہیں، اور نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

انی یوفکون. (المائدہ: ۷۵) وہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

لآیت لقوم یعقلون. (البقرة:۶۴) نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

افلا تعقلون. (الانعام:۳۲) کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

لو تَشعُرُونَ. (الشعراء:۱۱۳) کاش تم شعور رکھتے۔

افَلا یَسمعُونَ. (السجدہ:۲۶) کیا وہ سنتے ہی نہیں۔

انما یتذکر اولوا الباب. (الزمر:۹) نصیحت صرف اہلِ عقل وخرد ہی حاصل کرتے ہیں۔

وما یذکر الا اولوا الالباب. (البقرة:۲۶۹) اور صحیح یہ ہے کہ صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

افلا تتفکرون. (البقرة:۲۱۹) کیا تم غور نہیں کرتے۔

افلا تتذکرون. (الانعام:۸۰) پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔

قرآن حکیم نے جہاں کہیں اپنے پیش کردہ دین کے اقتضا کے مطابق کوئی بات پیش کی ہے، وہاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ اور جب ارکانِ دین میں سے کسی رُکن، اور عقاید میں کسی عقیدے کی دعوت دی ہے تو اس میں ایسی باتوں کا شائبہ تک نہیں ہے، جن کا انسانی عقل احاطہ نہیں کرسکتی اور جن کے ادراک سے فہمِ بشری عاجز ہے۔ اور جب اصولِ دین میں سے کسی اصل کی تلقین کی ہے تو مقدماتِ نظری سے ابتدا کی ہے، اور پھر کفر وعناد کی بنا پر اس سے انکار کرنے کے انجام سے ڈرایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے:

لِیھلکُ مَن ھلک عن بینةٍ ویحیا من حَیّ عن بَیّنةٍ. (الانفال:۴۲)

تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے، وہ حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے۔

ایک اور دوسری جگہ فرمایا:

لئلا یکون للناس علی اللہ حجة. (النساء:۱۶۵) تاکہ لوگوں کے لیے خدا

پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

قرآن نازل کرنے والا جلیل الحکمت خدا، جو انسان کا خالق اور دلوں اور کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اپنی آیات میں اپنے آپ کو کمالِ مطلق ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جس کا اظہار اس کے اسمائے حسنٰی سے ہوتا ہے، مثلاً عدل، حق، خیر، اس بنا پر اس نے اپنے رسولوں کو جبار و قہار بنا کے نہیں بھیجا بلکہ خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کے بھیجا ہے:

فذکّر انمَا اَنتَ مذکِرّہ لستَ عَلیھِم بمُسیطرٍ. (الغاشیہ: ۲۱، ۲۲)

''تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو اور لوگوں کو سمجھاؤ، کیوں کہ تم فقط سمجھانے والے ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔''

فَھَل عَلی الرُّسلِ الاالبَلا غ المُبین. (النحل: ۳۵)

''تو کیا رسولوں پر اس سے زیادہ بھی کوئی ذمہ داری ہے کہ صاف صاف احکامِ الٰہی پہنچادیں؟''

اَفانتَ تُکرِہ الناسَ حتی یَکونوا مُؤمِنین. (یونس: ۹۹)

''کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مومن بن جائیں؟''

وما نرسل المرسلین الا مبشرین و منذرین ویجادل الذین کفروا بالباطل لید حضوا به الحق. (الکھف: ۵۶)

اور ہم تو رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ نیکوکاروں کو نجات کا مژدہ سنائیں اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرائیں۔ مگر ان سے اہلِ کفر باطل کے بل پر جھگڑا کرتے ہیں کہ اس طرح حق کو روند ڈالیں۔

وما انتَ علیھم بجبارٍ فذکّر بالقرآن مَن یخاف وَعید. (ق: ۴۵)

اور تم ان پر جبر کرنے والے نہیں بنائے گئے۔ تمہارا کام تو بس یہی ہے کہ جو وعید سے ڈرے اس کو قرآن کے ذریعے سمجھا دے۔

پہلی چیز جس کے لیے قرآن نے عقل کو حکم بنایا ہے، وہ خدا کے وجود پر ایمان ہے۔

نہ صرف قرآن، بلکہ اس کے علاوہ کلام و اصولِ دین بھی سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس عقیدے کی طلب طریقِ نظر و استدلال سے ہونی چاہیے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ پر تقلیدی ایمان لانے کو قبول ہی نہیں کیا ہے۔ اور اگر امام 'غزالی' وغیرہ نے تقلیدی ایمان کو قبول بھی کیا ہے تو وہ عوام کے لیے ایک رعایت ہے کہ وہ بحث ونظر کی استطاعت نہیں رکھتے، اور اس کے وسائل سے بے بہرہ ہیں۔ یا ان کے قوائے ادراکیہ اتنے قوی نہیں کہ بحث ونظر کی شرائط پوری کرسکیں۔ اس بنا پر ان سے ایمان ثابت قبول کرلیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کا کوئی سورۃ آپ کو ایسا نہیں ملے گا، جس میں اس نے انسان کو بحث ونظر اور تعقل وتفکر کی دعوت نہ دی ہو۔ یہاں ان سب آیات کا استیعاب ممکن نہیں ہے، صرف چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

وهو الّذِی مدّ الارضَ وجَعَل فِیها رَواسِیَ وانهاراً و من کل الثّمراتِ جَعَل فیها زوجین اثنین. یغشِی اللّیلَ النهارَ، أنّ فی ذالک لایتٍ یقومِ یَتفکرونَ. وفی الارض قطع متجاوزات وجنتٍ من اَعنابٍ وزرعٍ ونخیلٍ صنوان وغیرصنوان یسقی بماء واحد ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل ان فی ذالک الایت لقوم یعقلون. (الرعد: ۳-۴)

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں۔ اور وہی رات کو دِن پر ڈھانک دیتا ہے۔ یقیناً اس میں غور کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعے ہوتے ہیں، جن میں انگور کے باغ اور کھتیاں اور کھجور کے درخت دوشاخے اور اکہرے سبھی کچھ ہوتے ہیں، حال آں کہ سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ پھر بھی ہم بعض کو بعض پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں۔ یقیناً خردمندوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

ان فی خلقِ السّموتِ والأرضِ واختلاف اللّیلِ والنَّهارِ والفَلکِ اللتی تجری فِی البَحرِ بِمَا یَنفعُ النّاسَ ومَا انزلَ اللّٰهُ من السماءِ من ماءٍ فاحیا به الارضَ

بعد موتِها وبثَّ فيها من كلِ دَابة وتصريفِ الرياحِ والسحابِ المسخَربين السَماءِ والارضِ لآياتٍ لقوم يعقلون. (البقرة: ۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور شب و روز کے اُلٹ پھیر اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لیے سمندر میں چلتی ہیں۔ اور اس پانی میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس کے ذریعے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کر دیتا ہے، اور پھر اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں کی گردش اور زمین و آسمان کے درمیان گھرے ہوئے بادلوں میں ارباب عقل کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

اَفلا يَنظُرونَ اِلى الابلِ كَيفَ خُلِقَت. والى السَّماءِ كيفَ رُفِعت. والى الجِبَال كَيفَ نُصِبت. والى الارض كَيفَ سُطِحت. (الغاشيه: ۲۰)

کیا نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کس نہج پر پیدا کیا گیا ہے، اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس قرینے سے بلند کیا گیا ہے اور زمین نہیں دیکھتے کہ کس انداز سے بچھائی گئی ہے۔

وفى انفسكم افلا تبصرون. (الزاريات: ۲۱)

اور خود تمہاری ذات کے اندر کیسی نشانیاں ہیں، کیا تم ان کو بھی نہیں دیکھتے؟

سَنرِيهم آيتِنا فِى الآفاقِ وفى انفسِهم حتّى يتبين لهم انه الحق. (الشورى: ۵۳)

ہم ان کو تمام اطرافِ عالم میں اور خود ان کی اپنی ذات کے اندر اپنی نشانیاں دِکھائیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ قرآن برحق ہے۔

اَولم يَنظُروا فِى ملكوتِ السَموتِ والأرضِ وما خلق من شئ. (الأعراف: ۱۸۵)

کیا اُنھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور خدا کی پیدا کی ہوئی کسی چیز پر بھی نظر نہیں کی؟

محترم حضرات!

یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس باب میں جتنی آیات قرآنِ کریم میں وارد ہوئی ہیں، ان سب کا استقصاء کیا جائے۔ اس لیے انھی چند اقتباسات پر اکتفا کر کے اب ہم ایک دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہیں؟ جس میں اکثر بحث کرنے والوں نے چکر کھائے ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کیا جائے گا جس نے بحث ونظر سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، اور اس کے باوجود وہ دین میں عقیدۂ حق تک نہ پہنچ سکا۔ اس مسئلہ میں علما نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ رائے کیا ہے۔ لیکن میں یہاں ان کی بحثوں سے تعرض نہ کروں گا، اور خود قرآن مجید سے استفتا کروں گا کہ ایسے شخص کے حق میں وہ کیا کہتا ہے۔

قرآن مجید سے استفتاء کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ چند مسلمات ذہن نشین کرلیں۔

اوّل یہ کہ جب کسی حکم پر دلیلِ صحیح قائم ہو جائے تو عقلِ بشری اس میں شک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

دوم یہ کہ عقلِ بشری میں یہ قدرت نہیں ہے کہ دو متناقض امور کے معاً صحیح ہونے کو جائز رکھے۔

سوم یہ کہ جب دو حکم متعارض ہوں اور ان میں سے ایک حکم کی تائید میں قاطع حجتیں (یقینی دلائل) موجود ہوں تو عقل کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو قبول کرے۔

دینِ فطرت نے ان تینوں فطری قضیوں کو ملحوظ رکھا ہے، اور آسمانی کتاب نے ان کی تصدیق کی ہے۔ پھر اس کے بعد علماء نے بحث ونظر کر کے ان قضیوں کو استوار کیا، اور فرعی مسائل میں مختلف ہونے کے باوجود ان سب نے اس قاعدہ کلیہ کو تسلیم کیا ہے کہ شرعیات میں سے جو چیز بھی بظاہر خلافِ عقل معلوم ہو، اس کی تاویل اس طرح کی جائے کہ وہ حکمِ عقلی کے مطابق ہو جائے۔ کیا یہ مسلمات عقلیہ کے حدود پر ٹھہراؤ اور فطرتِ بشریہ کے حکم پر نزول نہیں

ہے؟ اور کیا اس قاعدے کے باوجود عقائد میں جبر اور زبردستی ہوسکتی ہے؟ اور کیا دینِ فطرت، جو دینِ بحث ونظر ہے، ان لوگوں کو کسی عقیدے پر مجبور کرسکتا ہے جن کی عقلیں اس عقیدے کے ادراک سے قاصر ہوں؟ یا جن پر شکوک وشبہات کا اتنا ہجوم ہو کہ وہ ان کو دور کرنے اور انہیں روکنے سے عاجز رہ گئے ہیں؟ اور کیا وہ دین جبر اور زبردستی کا قائل ہوسکتا ہے، جس نے غیر معقولات پر ایمان لانے کی سخت مانعت کی ہے؟ اور جس نے ایسے ایمان کے مقابلے میں اس یقینی عقیدۂ ایمان کی بنیادیں قائم کی ہیں جو طریق عقل ونظر سے حاصل ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا عدل اس سے بالاتر ہے کہ وہ لوگوں کو اس چیز کی تکلیف دے جس کی ان میں طاقت نہ ہو۔ یا ایسی چیزوں پر ایمان لانا۔ ان پر لازم کرے جن کی طرف حجت اور برہان ان کی ہدایت نہ کرتی ہو۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور کرنے سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ

لئلا یکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل. (النساء:۱۶۵)

تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

اب ہم قرآنِ کریم کی ان آیات میں سے بعض تلاوت کرتے ہیں جو اس مقام سے مناسبت رکھتی ہیں:

قال یقوم ارأیتم ان کنتُ علی بیّنةٍ من رِبّی وآتانی رحمةً مِن عِندہ فعُمّیتْ علیکم أنُلزِمکموھا وانتم لھا کارھون؟ (ھود:۲۸)

نوح نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم نے غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے رستے پر ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت عطا فرمائی ہے۔ پھر وہ رستہ تم کو دکھائی نہیں دیتا تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس پر چلائیں گے دراں حالے کہ تم اس کو ناپسند کرتے ہو؟

نحن اعلم بما یقولون ومَا أنت عَلیھِم بجبّار. فَذکِرّ بالقرآن من یخاف وعید. (ق:۴۵)